ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY

Name:

Registration No.:

Course Code: 2628

Program: M.A. Islamic Studies

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کلیۂ عربی وعلوم اسلامیہ

(شعبۂ فکرِ اسلامی، تاریخ وثقافت)

کورس: فلسفہ ورعلم الکلام (2628)

سطح: ایم اے علومِ اسلامیہ

سمسٹر: خزاں 2026ء

امتحانی مشق نمبر 1 (یونٹ نمبر 1–4)

کل نمبر: 100 — کامیابی کے نمبر: 40

Reference &For Study — SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعے اور حوالے کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ سے گزارش ہے کہ متعلقہ یونٹس کا خود مطالعہ کریں، مفاہیم کو سمجھیں اور امتحانی مشق اپنے الفاظ میں تحریر کریں۔

سوال نمبر 1: فلسفے کی جستجو کن بنیادی انسانی سوالات سے جنم لیتی ہے؟(20)

تعارف

فلسفہ انسان کی اس فطری جستجو کا نام ہے جس میں وہ اپنے آپ کو، کائنات کو اور زندگی کے مقصد کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ انسان صرف کھانے پینے اور مادی ضروریات تک محدود رہنے والا وجود نہیں ہے؛ وہ سوال کرنے والا وجود ہے۔ بچہ چاند کو دیکھ کر پوچھتا ہے کہ یہ کیا ہے، جوان موت کو دیکھ کر پوچھتا ہے کہ زندگی ختم کیوں ہو جاتی ہے، اور مفکر کائنات کی وسعت دیکھ کر پوچھتا ہے کہ اس سب کے پیچھے کوئی نظام، کوئی علت اور کوئی معنی ہے یا نہیں۔ فلسفے کی جستجو انہی سوالات سے جنم لیتی ہے۔ یہ سوالات کسی ایک قوم، ایک مذہب یا ایک دور تک محدود نہیں؛ ہر تہذیب میں انسان نے کسی نہ کسی صورت میں یہی سوالات اٹھائے ہیں۔ اس جواب میں ان بنیادی سوالات کو باقاعدہ ترتیب سے بیان کیا جائے گا تاکہ واضح ہو کہ فلسفہ کوئی بے مقصد ذہنی مشق نہیں بلکہ انسانی فطرت کے گہرے سوالات کا سنجیدہ جواب تلاش کرنے کی کوشش ہے۔

یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ فلسفیانہ سوالات عام سوالات سے مختلف ہوتے ہیں۔ عام سوال کا جواب مشاہدے یا خبر سے مل جاتا ہے، مثلاً یہ کہ فلاں شہر کتنی دور ہے۔ فلسفیانہ سوال اس سے آگے جاتا ہے؛ وہ پوچھتا ہے کہ دور ہونے کا مطلب کیا ہے، جاننا کسے کہتے ہیں، اچھا اور برا کس معیار سے طے ہوتا ہے اور انسان کو کیسے جینا چاہیے۔ ان سوالات کے جوابات حتمی اور آخری صورت میں ہمیشہ متنازع رہتے ہیں، اسی لیے فلسفہ ہر دور میں زندہ رہتا ہے۔ ہر نسل اپنے حالات اور تجربات کی روشنی میں انہی پرانے سوالات کو نئے انداز میں پوچھتی ہے۔ یہی تسلسل فلسفے کو ایک زندہ علم بناتا ہے اور طالب علم کے لیے اس کے مطالعے کو ذاتی طور پر بھی اہم بنا دیتا ہے، کیونکہ یہ سوالات بالآخر اس کی اپنی زندگی کے سوالات ہیں۔

حیرت، تجسس اور جستجو کا آغاز

فلسفے کا پہلا محرک حیرت ہے۔ جب انسان کائنات کے نظم، موسموں کی تبدیلی، ستاروں کی گردش، زندگی کی پیدائش اور موت کے اٹل قانون کو دیکھتا ہے تو اس کے دل میں حیرت پیدا ہوتی ہے اور حیرت سے سوال جنم لیتا ہے۔ قدیم یونانی مفکرین نے بھی فلسفے کی ابتدا حیرت سے بیان کی ہے اور یہ بات آج بھی درست محسوس ہوتی ہے۔ جو انسان ہر

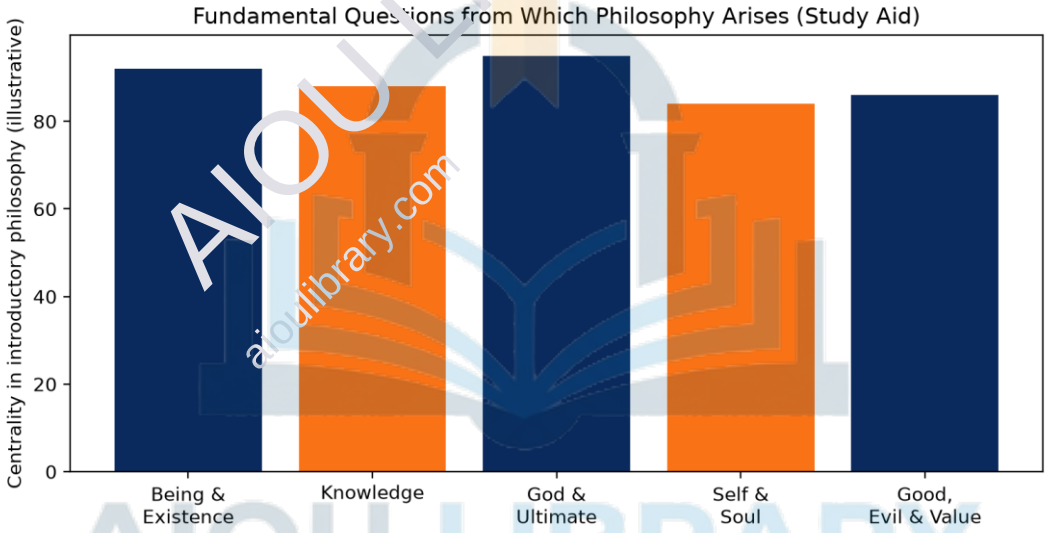
چیز کو معمول سمجھ کر گزر جائے اس کے اندر فلسفیانہ جستجو پیدا نہیں ہوتی۔ فلسفہ وہیں شروع ہوتا ہے جہاں انسان رک کر پوچھتا ہے کہ یہ سب کیوں ہے، کیسے ہے اور اس کے پیچھے کیا حقیقت ہے۔ بارش، زلزلے، بیماری اور موت جیسے واقعات ابتدا میں انسان کے لیے پراسرار تھے؛ ان کی توجیہ کے لیے پہلے اساطیر وجود میں آئیں اور پھر بتدریج عقلی توجیہ یعنی فلسفے نے جنم لیا۔ اس طرح فلسفے کی جستجو کا پہلا سوال یہی ہے کہ ظاہری واقعات کے پیچھے پوشیدہ نظام اور علت کیا ہے۔

دوسرا محرک عملی ضرورت ہے۔ انسان کو زندگی میں فیصلے کرنے پڑتے ہیں: کس بات کو سچ مانے، کس رویے کو اچھا سمجھے، کس مقصد کے لیے جیے اور موت کے بعد کیا ہوگا۔ یہ فیصلے اس وقت تک غیر یقینی رہتے ہیں جب تک ان کے پیچھے موجود بنیادی سوالات کا تسلی بخش جواب نہ ملے۔ اس لیے فلسفہ محض کتابی علم نہیں بلکہ زندگی گزارنے کی بنیاد فراہم کرنے کی کوشش ہے۔ جب معاشرے میں پرانے عقائد کمزور ہوتے ہیں، سائنس نئے انکشافات کرتی ہے یا سیاسی و سماجی تبدیلیاں پرانے جوابات کو ناکافی بنا دیتی ہیں تو فلسفیانہ سوالات پھر شدت سے اٹھتے ہیں۔ یونان میں فلسفے کا عروج، مسلم تہذیب میں فلسفہ و کلام کی نشوونما اور جدید یورپ میں فلسفے کی نئی تحریکیں اسی انداز کی مثالیں ہیں کہ جستجو ہمیشہ کسی فکری بے چینی سے پیدا ہوتی ہے۔

وجود کا سوال: کیا ہے اور کیوں ہے؟

فلسفے کا سب سے بنیادی سوال وجود کا سوال ہے۔ یہ کیا ہے؟ کائنات کیسے وجود میں آئی؟ کیا یہ ہمیشہ سے ہے یا اس کا کوئی آغاز ہے؟ مادہ اصل ہے یا اس کے پیچھے کوئی غیر مادی حقیقت کارفرما ہے؟ تبدیلی کیا ہے اور ثبات کیا ہے؟ ایک چیز بدلتی بھی ہے اور پہچانی بھی جاتی ہے، اس کی توجیہ کیسے ہو؟ یہ سوالات فلسفے کی شاخ مابعد الطبیعیات کی بنیاد ہیں۔ انسان اپنے اردگرد ہر چیز کو پیدا ہوتے، بدلتے اور ختم ہوتے دیکھتا ہے۔ وہ خود بھی بچپن سے بڑھاپے تک بدلتا ہے لیکن اپنے آپ کو وہی شخص سمجھتا ہے۔ اس تجربے سے وہ پوچھنے پر مجبور ہوتا ہے کہ ظاہری تبدیلی کے پیچھے دائمی حقیقت کیا ہے۔ یہی سوال آگے چل کر خدا، روح، مادے اور کائنات کی اصل کے بارے میں طویل بحثوں کی بنیاد بنتا ہے اور مختلف مکاتب فکر اسی ایک سوال کے مختلف جوابات سے تشکیل پاتے ہیں۔

وجود کے سوال سے جڑا ہوا دوسرا سوال علت کا سوال ہے۔ ہر واقعے کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے؛ انسان اسی اصول پر اپنی روزمرہ زندگی چلاتا ہے۔ فلسفہ اس اصول کو کائنات کی مجموعی سطح پر لے جاتا ہے اور پوچھتا ہے کہ واقعات کے اس لامتناہی سلسلے کی پہلی علت کیا ہے۔ کیا سلسلہ علت و معلول ہمیشہ سے چل رہا ہے یا کہیں رک کر کسی ایسی ہستی پر منتہی ہوتا ہے جو خود کسی علت کی محتاج نہیں؟ اسی طرح نظم و ضبط کا سوال ہے۔ کائنات میں حیران کن ترتیب پائی جاتی ہے؛ قوانین فطرت باقاعدگی سے کام کرتے ہیں۔ کیا یہ نظم اتفاق ہے یا کسی مدبر حکمت کا نتیجہ ہے؟ یہ سوالات سائنس کے سوالات سے مختلف ہیں کیونکہ سائنس کسی واقعے کی قریبی وجہ بتاتی ہے جبکہ فلسفہ آخری اور بنیادی وجہ تک پہنچنا چاہتا ہے۔ اسی لیے وجود اور علت کے سوالات فلسفے کی جستجو کا مرکز سمجھے جاتے ہیں۔



شکل: وہ بنیادی سوالی شعبے جن سے فلسفیانہ جستجو جنم لیتی ہے (مطالعے کے لیے تمثیلی خاکہ)

علم اور معرفت کا سوال: ہم جانتے کیسے ہیں؟

تیسرا بنیادی سوال علم کا سوال ہے۔ ہم جو کچھ جانتے ہیں وہ واقعی درست بھی ہے یا محض ہمارا گمان ہے؟ جاننے کے ذرائع کیا ہیں: حواس، عقل، وجدان، تجربہ یا وحی؟ حواس کبھی دھوکا بھی دیتے ہیں؛ پانی میں ٹیڑھی نظر آنے والی لکڑی سیدھی ہوتی ہے، دور سے چھوٹی نظر آنے والی چیز بڑی ہو سکتی ہے۔ اس تجربے سے انسان پوچھتا ہے کہ یقینی علم کیسے حاصل ہو اور سچ اور جھوٹ میں تمیز کا معیار کیا ہو۔ یہ سوالات فلسفے کی شاخ علمیات کی بنیاد ہیں۔ علم کے سوال کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ ہے کہ باقی تمام سوالات کے جوابات

اسی پر منحصر ہیں۔ اگر ہمارے ذرائع علم ہی قابل اعتماد نہ ہوں تو خدا، اخلاق اور کائنات کے بارے میں ہمارے جوابات بھی مشکوک ہو جائیں گے۔ اسی لیے ہر بڑا فلسفی نظام سب سے پہلے یہ طے کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ علم کیا ہے اور اس کی حد کہاں تک ہے۔

علم کے سوال سے کئی ذیلی سوالات نکلتے ہیں۔ کیا علم صرف حواس سے حاصل ہوتا ہے یا عقل حواس سے آگے بھی جا سکتی ہے؟ کیا کچھ سچائیاں پیدائشی طور پر ذہن میں موجود ہوتی ہیں؟ کیا خواب اور بیداری کے تجربے میں فرق کیسے ثابت کیا جائے؟ کیا دوسرے انسانوں کے ذہن اور احساسات کو ہم واقعی جان سکتے ہیں؟ جدید دور میں سائنس کی کامیابی نے یہ سوال اور تیز کر دیا ہے کہ کیا قابل اعتماد علم صرف وہی ہے جو تجربے اور پیمائش سے ثابت ہو، یا اخلاقی و مذہبی سچائیوں کا بھی کوئی معتبر ذریعہ موجود ہے۔ مسلم فلسفے میں اس بحث کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے کیونکہ وہاں عقل کے ساتھ وحی کو بھی علم کا مستقل ذریعہ مانا گیا ہے۔ ان تمام سوالات کی موجودگی ظاہر کرتی ہے کہ معرفت کا سوال فلسفیانہ جستجو کا لازمی حصہ ہے۔

خدا، انسان اور زندگی کے مقصد کے سوالات

چوتھا بڑا سوال خدا اور آخری حقیقت کا سوال ہے۔ کیا کائنات کے پیچھے کوئی خالق اور مدبر موجود ہے؟ اگر ہے تو اس کی صفات کیا ہیں؟ وہ ایک ہے یا اس تصور کی دیگر صورتیں ممکن ہیں؟ انسان کا اس سے تعلق کیا ہے؟ یہ سوالات فلسفہ مذہب اور علم الکلام دونوں کا مرکزی موضوع رہے ہیں۔ ان سوالات کا محرک صرف نظری جستجو نہیں؛ انسان اپنے دکھ، بیماری، ظلم اور موت کے تجربے میں بھی پوچھتا ہے کہ اگر کوئی عادل و رحیم ہستی ہے تو دنیا میں شر کیوں ہے۔ خیر و شر کا یہ مسئلہ آگے الگ سوال میں بھی زیر بحث آئے گا۔ یہاں اتنا کافی ہے کہ خدا سے متعلق سوالات انسان کی فطرت میں اس لیے گہرے ہیں کہ ان کے جواب سے زندگی کا پورا رخ متعین ہوتا ہے: اگر خالق موجود ہے تو زندگی بامقصد ہے اور انسان جواب دہ ہے؛ اگر نہیں تو مقصد انسان کو خود بنانا پڑے گا۔

جدول: بنیادی سوالات اور فلسفے کی متعلقہ شاخیں

مرکزی بحث	فلسفے کی شاخ	بنیادی سوال

وجود، علت، خدا، روح	مابعد الطبیعیات	کیا ہے اور کیوں ہے؟
علم کے ذرائع اور حدود	علمیات	ہم جانتے کیسے ہیں؟
خیر و شر اور درست رویہ	اخلاقیات	اچھا اور برا کیا ہے؟
حسن اور فن کا معیار	جمالیات	خوبصورت کیا ہے؟
دلیل کی صحت کے اصول	منطق	درست استدلال کیسے ہو؟
معنی، موت اور آخرت	فلسفہ حیات / مذہب	زندگی کا مقصد کیا ہے؟

پانچواں سوال انسان کے بارے میں ہے۔ انسان کیا ہے؟ کیا وہ صرف جسم ہے یا جسم اور روح کا مجموعہ ہے؟ کیا اسے اختیار حاصل ہے یا وہ حالات کا پابند ہے؟ موت کے بعد کیا ہوتا ہے؟ خوشی کس چیز میں ہے اور اچھی زندگی کسے کہتے ہیں؟ یہ سوالات ہر انسان کے لیے ذاتی اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ ان کے جواب سے اس کی خود شناسی، اس کے فیصلے اور اس کی امیدیں وابستہ ہیں۔ ایک مریض، ایک قیدی، ایک مہاجر اور ایک کامیاب تاجر سب کسی نہ کسی لمحے یہ سوالات پوچھتے ہیں۔ فلسفہ ان سوالات کو منظم صورت دیتا ہے، دلائل کی زبان میں بیان کرتا ہے اور مختلف جوابات کا تنقیدی جائزہ لیتا ہے۔ اسی سے اخلاقیات کی شاخ بھی جنم لیتی ہے جو پوچھتی ہے کہ اچھا عمل کیا ہے، انصاف کیا ہے، اور فرد و معاشرے کے حقوق کیسے طے ہوں۔ یوں فلسفے کی جستجو نظری ہونے کے ساتھ ساتھ گہری عملی جستجو بھی ہے۔

شک، تنقید اور جوابات کی تلاش

فلسفیانہ جستجو کی ایک خصوصیت شک اور تنقید ہے۔ فلسفی کسی بات کو صرف اس لیے قبول نہیں کرتا کہ وہ مشہور ہے یا بڑوں نے کہی ہے؛ وہ دلیل مانگتا ہے۔ یہ شک تباہ کن شک نہیں بلکہ تعمیری شک ہے جس کا مقصد کمزور بنیادوں کو چھوڑ کر مضبوط بنیاد تک پہنچنا ہے۔ تاریخ فلسفہ میں بار بار دیکھا گیا ہے کہ ایک دور کے یقینی جوابات اگلے دور میں سوالات بن جاتے ہیں اور نئے جوابات سامنے آتے ہیں۔ یہ حرکت فلسفے کی کمزوری نہیں بلکہ اس کی زندگی ہے۔ البتہ یہ بھی درست ہے کہ ہر سوال کا جواب صرف عقل سے مکمل طور پر

نہیں ملتا؛ مسلم مفکرین نے اسی نکتے پر وحی اور نقل کی رہنمائی کو بھی علم کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ اس طرح اسلامی تناظر میں فلسفیانہ جستجو عقل کو استعمال بھی کرتی ہے اور اس کی حدود کا اعتراف بھی کرتی ہے، جو اسے مغربی فلسفے کی بعض یک طرفہ صورتوں سے ممتاز کرتا ہے۔

آخر میں یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ بنیادی سوالات ایک دوسرے سے الگ تھلگ نہیں ہیں۔ وجود کا جواب علم کے جواب سے جڑا ہے، خدا کا تصور اخلاق کے معیار کو متاثر کرتا ہے، اور انسان کا تصور ریاست و معاشرے کے نظریات بناتا ہے۔ اسی باہمی ربط کی وجہ سے فلسفے کو ایک کلی نظام کی تلاش کہا جاتا ہے۔ طالب علم جب ان سوالات کو الگ الگ پڑھتا ہے تو اسے ہر بڑے فلسفی کے نظام کی ساخت سمجھ آنے لگتی ہے، کیونکہ ہر نظام دراصل انہی سوالات کے جوابات کا ایک مجموعہ ہوتا ہے۔ یہ نقشہ ذہن میں ہو تو فارابی، ابن سینا، غزالی اور جدید مفکرین کو پڑھنا آسان ہو جاتا ہے اور ان کے اختلافات کی وجہ بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اختلاف اکثر انہی بنیادی سوالات کے جواب میں ہوتا ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ فلسفے کی جستجو انسان کے ان بنیادی سوالات سے جنم لیتی ہے جو حیرت اور تجسس سے پیدا ہوتے ہیں: کائنات کیا ہے اور کیوں ہے، اس کی پہلی علت کیا ہے، ہم سچ کو جانتے کیسے ہیں، خدا اور آخری حقیقت کا تصور کیا ہے، انسان کی حقیقت، اختیار اور انجام کیا ہے، اچھا اور برا کس معیار سے طے ہوتا ہے اور اچھی زندگی و منصفانہ معاشرہ کیسا ہونا چاہیے۔ یہ سوالات مابعد الطبیعیات، علمیات، اخلاقیات، جمالیات اور منطق جیسی شاخوں کی بنیاد بنتے ہیں۔ ان کا کوئی ایک جواب سب کے لیے آخری نہیں، مگر ان کا پوچھنا ہی انسان کو اندھی تقلید سے نکال کر شعوری زندگی کی طرف لے جاتا ہے۔ یہی شعور فلسفے کی اصل دین ہے اور آج کے طالب علم کے لیے بھی یہی سوالات اس کی فکری تربیت کا نقطہ آغاز ہیں۔

سوال نمبر 2: فارابی کے فلسفے میں عقل کا مقام کیا ہے؟(20)

تعارف

ابو نصر فارابی مسلم فلسفے کے عظیم مفکر ہیں جنہیں ارسطو کے بعد معلم ثانی کہا جاتا ہے۔ ان کے فلسفے میں عقل کو مرکزی اور فیصلہ کن مقام حاصل ہے۔ فارابی کے نزدیک عقل وہ جوہر ہے جو انسان کو حیوان سے ممتاز کرتا ہے، علم کو ممکن بناتا ہے، کائنات کے نظام کو سمجھنے کا ذریعہ ہے اور انسانی سعادت کی کنجی ہے۔ ان کا نظام مابعد الطبیعیات، علمیات، نفسیات، اخلاق اور سیاست سب کو عقل کے تصور سے جوڑتا ہے۔ اس جواب میں پہلے فارابی کے ہاں عقل کے مختلف مدارج بیان کیے جائیں گے، پھر عقل فعال کا تصور، اس کا علم و نبوت سے تعلق، اور آخر میں اخلاق و سیاست میں عقل کے مقام اور اس پر ہونے والے تنقیدی سوالات کا جائزہ لیا جائے گا تاکہ سوال کا تقاضا پوری طرح پورا ہو۔

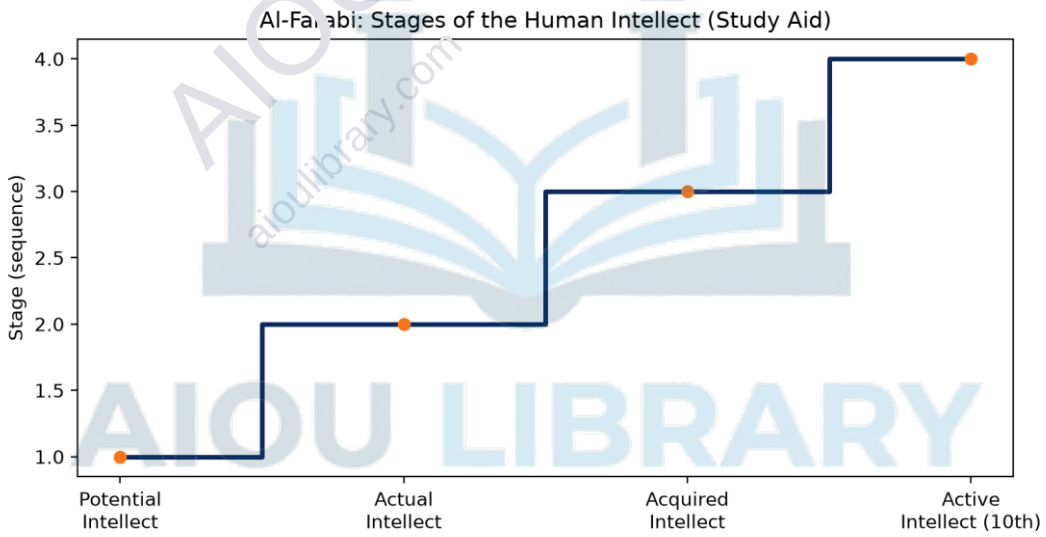
فارابی کے فلسفیانہ پس منظر کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ وہ اس دور میں سامنے آئے جب یونانی فلسفہ عربی میں منتقل ہو چکا تھا اور مسلم مفکرین ارسطو و افلاطون کے نظاموں کو اسلامی عقائد سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ فارابی نے اس کام کو سب سے منظم صورت دی۔ انہوں نے صدور کے نظریے کے ذریعے کائنات کی تخلیق اور ترتیب کو عقلی نظام میں بیان کیا اور انسان کی عقل کو اسی کائناتی ترتیب سے جوڑا۔ اس لیے ان کے ہاں عقل کوئی انفرادی ذہنی صلاحیت ہی نہیں بلکہ کائنات کے عقلی نظم کا حصہ ہے۔ یہی وسعت ان کے تصور عقل کو منفرد بناتی ہے اور اسی وجہ سے بعد کے مفکرین، خصوصاً ابن سینا، ان سے گہرے متاثر ہوئے۔

صدور کا نظریہ اور کائناتی عقل

فارابی کے نظام کی ابتدا واجب الوجود یعنی اللہ تعالیٰ سے ہوتی ہے جو کامل، واحد اور ہر نقص سے پاک ہے۔ فارابی کے بیان کے مطابق اس واحد ذات سے پہلی عقل کا صدور ہوتا ہے، اس سے اگلی عقل اور فلک، اور یوں عقول و افلاک کا سلسلہ دسویں عقل تک پہنچتا ہے جسے عقل فعال کہا جاتا ہے۔ یہ نظریہ ارسطو و نو افلاطونی فکر سے متاثر ہو کر اسلامی تناظر میں پیش کیا گیا۔ اس میں قابل توجہ بات یہ ہے کہ پوری کائنات عقلی ترتیب سے بنی ہوئی سمجھی گئی ہے۔ اوپر سے نیچے تک ہر مرتبہ ایک عقل سے وابستہ ہے۔ اس کائناتی

پس منظر میں انسانی عقل آخری اور زمینی حلقہ ہے جو عقل فعال سے فیض پا کر کامل ہوتی ہے۔ یوں فارابی کے ہاں عقل کا مقام صرف نفسیات تک محدود نہیں رہتا؛ وہ پورے وجود کی ساخت ہے۔

اس نظریے پر بعد میں علم الکلام کے علما نے تنقید بھی کی، خصوصاً یہ سوال کہ صدور کا عقلی بیان تخلیق کے قرآنی تصور سے کس حد تک ہم آہنگ ہے۔ یہ تنقید اپنی جگہ اہم ہے اور اس گائیڈ میں اسے چھپایا نہیں جا رہا۔ فارابی کے مدافعین کہتے ہیں کہ انہوں نے صدور کو بھی اللہ کی مشیت و قدرت کے تابع سمجھا اور ان کا مقصد کائنات کے نظم کو عقلی طور پر سمجھانا تھا۔ طالب علم کے لیے متوازن رویہ یہی ہے کہ فارابی کے نظام کو تاریخِ فلسفہ میں اس کے مقام کے ساتھ سمجھا جائے، اس کی عقلی خوبیاں بھی دیکھی جائیں اور اس پر ہونے والی علمی تنقید سے بھی آگاہی رکھی جائے۔ کسی مخصوص عقیدے کے اطلاق کا حتمی فیصلہ اہلِ علم کا کام ہے؛ یہاں بحث خالص علمی و تعلیمی ہے۔



شکل: فارابی کے نزدیک انسانی عقل کے مدارج اور عقلِ فعال سے اتصال (مطالعے کے لیے تمثیلی خاکہ)

انسانی عقل کے مدارج

فارابی نے انسانی عقل کے کئی مرتبے بیان کیے ہیں۔ پہلا مرتبہ عقلِ بالقوہ ہے، یعنی وہ استعداد جو ہر انسان میں پیدائشی طور پر موجود ہوتی ہے مگر ابھی علم سے خالی ہوتی ہے، جیسے بچے کی سیکھنے کی صلاحیت۔ دوسرا مرتبہ عقلِ بالفعل ہے، جب انسان محسوسات اور ابتدائی کلیات کو حاصل کر کے واقعی سوچنے لگتا ہے۔ تیسرا مرتبہ عقلِ مستفاد ہے، جب عقل

ان معقولات کو اس درجے حاصل کر لیتی ہے کہ وہ عقل فعال سے قریب ترین تعلق قائم کر سکے۔ ان مدارج کی تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ فارابی کے نزدیک علم کوئی جامد خزانہ نہیں بلکہ عقل کی تدریجی تکمیل کا سفر ہے۔ تعلیم، مطالعہ، استاد کی رہنمائی اور مسلسل غور و فکر اس سفر کے ذرائع ہیں۔ اس نظریے نے تعلیم کے فلسفے پر گہرا اثر ڈالا کہ سکھانا دراصل بالقوہ عقل کو بالفعل بنانے کا عمل ہے۔

جدول: فارابی کے ہاں عقل کے مدارج

مرتبہ	حالت	وضاحت
عقل بالقوہ	استعداد	پیدائشی صلاحیت، علم ابھی حاصل نہیں
عقل بالفعل	عملی سوچ	محسوسات سے کلیات کا ادراک شروع
عقل مستفاد	تکمیل یافتہ عقل	معقولات کا مکمل ادراک، عقل فعال سے قرب
عقل فعال	کائناتی عقل	دسویں عقل، فیض و الہام کا واسطہ

عقل فعال فارابی کے نظام کا سب سے اہم تصور ہے۔ یہ وہ عقل ہے جو انسانی عقل بالقوہ کو بالفعل بناتی ہے، مادی صورتوں کو معقول صورتوں میں ڈھالنے کی قوت دیتی ہے اور اسی سے بعض غیر معمولی ذہنوں کو خاص فیض حاصل ہوتا ہے۔ فارابی نے اس کی مثال سورج سے دی ہے جس طرح سورج کی روشنی سے آنکھ دیکھنے کے قابل ہوتی ہے اسی طرح عقل فعال کی روشنی سے انسانی عقل جاننے کے قابل ہوتی ہے۔ اس تشبیہ سے عقل کا مقام مزید واضح ہوتا ہے کہ انسانی عقل خود مختار روشنی نہیں بلکہ ایک بڑی کائناتی روشنی سے جڑ کر کام کرتی ہے۔ یہ تصور بعد میں ابن سینا کے ہاں بھی مرکزی رہا اور قرون وسطیٰ کے یورپی فلسفے پر بھی اس کے تراجم کے ذریعے اثرات مرتب ہوئے۔

عقل، علم اور نبوت کا تعلق

فارابی کے ہاں علم کی تکمیل عقل کے اسی اتصال سے ہوتی ہے۔ عام انسان تجربے، تعلیم اور استدلال سے علم حاصل کرتا ہے۔ لیکن فارابی نے فلسفی اور نبی کے علم میں خاص بحث کی ہے۔ ان کے نزدیک کامل فلسفی عقل مستفاد کے درجے پر استدلال سے حقائق تک پہنچتا ہے جبکہ نبی کو عقل فعال سے ایسا فیض حاصل ہوتا ہے کہ حقائق اس کی قوت متخیلہ میں مثالی اور علامتی صورتوں میں بھی ظاہر ہوتی ہیں، اس لیے وہ انھیں عام لوگوں تک ان کی سمجھ کے مطابق پہنچا سکتا ہے۔ فارابی کے اس بیان کو ان کی معروف کتابوں میں تفصیل سے پڑھا جا سکتا ہے۔ اس سے ان کے نظام میں نبوت اور فلسفے کو متصادم نہیں بلکہ ایک ہی حقیقت کے دو اظہار سمجھنے کی کوشش نظر آتی ہے، جہاں عقل دونوں کے درمیان مشترک بنیاد ہے۔

اس مقام پر تنقیدی توازن ضروری ہے۔ متکلمین اور بعد کے بہت سے علما نے فارابی و فلاسفہ کے نبوت کے اس فلسفیانہ بیان پر اعتراضات کیے اور وحی کو محض عقلی فیض کی صورت میں بیان کرنے کو ناکافی قرار دیا۔ ان کے نزدیک وحی اللہ کا براہِ راست کلام و انتخاب ہے جسے کلی طور پر انسانی عقل کے مدارج میں مقید نہیں کیا جا سکتا۔ طالب علم کو دونوں موقف تعلیمی طور پر معلوم ہونے چاہئیں۔ اس گائیڈ کا موقف بھی یہی متوازن تعلیمی موقف ہے کہ فارابی کے تصور کو تاریخی فلسفے کے تناظر میں بیان کیا جائے اور اس پر اہل سنت کے متکلمین کی تنقید کا ذکر بھی رکھا جائے، جبکہ عقیدے کے حتمی معاملات میں رہنمائی مستند اہل علم سے لی جائے۔ اس احتیاط کے ساتھ فارابی کا مطالعہ فکری وسعت بھی دیتا ہے اور اعتقادی توازن بھی برقرار رکھتا ہے۔

اخلاق، سعادت اور سیاست میں عقل

فارابی کے نزدیک انسان کی آخری سعادت عقل کی تکمیل میں ہے۔ جو عقل جسم کی خواہشات کی غلام بن جائے وہ اپنے مقصد سے ہٹ جاتی ہے؛ جو عقل معقولات کا ادراک کر کے فضائل اختیار کرے وہ سعادت کی طرف بڑھتی ہے۔ اخلاق میں اس کا عملی مطلب یہ ہے کہ عقل کو حاکم اور نفسانی قوتوں کو محکوم ہونا چاہیے۔ شہوت اور غضب کی قوتیں عقل کی رہنمائی میں اعتدال پر رہیں تو شجاعت، عفت اور عدالت جیسے فضائل پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے فارابی کی اخلاقیات دراصل عقل کی عملی حکومت کا نام ہے۔ انفرادی سطح

پر یہی اصول ان کی سیاست میں اجتماعی صورت اختیار کرتا ہے جہاں مدینہ فاضلہ کا سربراہ وہ شخص ہوتا ہے جس کی عقل سب سے کامل ہو اور جو عقل فعال سے سب سے زیادہ متصل ہو۔

مدینہ فاضلہ میں فارابی نے معاشرے کو جسم سے تشبیہ دی ہے جس میں دل کی حیثیت حاکم کامل کو حاصل ہے اور باقی طبقات اپنے اپنے درجے میں اپنے فرائض ادا کرتے ہیں۔ اس پوری ترتیب کا اصول عقل ہے۔ قانون، تعلیم اور سماجی تنظیم کا مقصد شہریوں کی عقل کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ سعادت حاصل کر سکیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فارابی کے ہاں عقل محض انفرادی ذہانت نہیں بلکہ تہذیب کی بنیاد ہے۔ آج کے دور میں بھی تعلیم کی منصوبہ بندی، تحقیق کی آزادی اور اہل علم کی قدر جیسے امور اسی اصول کی جدید صورتیں ہیں کہ معاشرہ عقل کی رہنمائی میں ترقی کرتا ہے۔ البتہ فارابی کے سیاسی نظام پر یہ تنقید بھی ہوتی رہی ہے کہ کامل حاکم کا تصور عملی دنیا میں مشکل سے ملتا ہے، اس لیے اسے ایک معیاری نمونے کے طور پر پڑھنا زیادہ درست ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ فارابی کے فلسفے میں عقل کو چار حیثیتوں سے مرکزی مقام حاصل ہے: وہ کائنات کی ساخت ہے کیونکہ صدور کا پورا نظام عقول پر قائم ہے، وہ علم کا ذریعہ ہے کیونکہ عقل فعال کے فیض سے انسانی عقل بالقوہ سے بالفعل ہوتی ہے، وہ سعادت کی کنجی ہے کیونکہ اخلاقی فضائل عقل کی حکومت سے پیدا ہوتے ہیں، اور وہ سیاست کی بنیاد ہے کیونکہ مدینہ فاضلہ کا نظم کامل عقل کی رہنمائی میں چلتا ہے۔ اس جامع مقام کی وجہ سے فارابی کو معلم ثانی کا درجہ ملا اور ان کا اثر ابن سینا سے لے کر یورپی اسکالاسٹک فکر تک پھیلا۔ ساتھ ہی ان کے نظام پر متکلمین کی تنقید بھی علمی تاریخ کا حصہ ہے جسے طالب علم کو توازن سے پڑھنا چاہیے۔ عقل کی یہ اہمیت آج بھی قائم ہے کہ تعلیم و تحقیق کے بغیر نہ فرد ترقی کرتا ہے نہ قوم۔

سوال نمبر3: فلسفے میں حقیقت کے تصور کو کس طرح سمجھا جاتا ہے؟(20)

تعارف

حقیقت فلسفے کے بنیادی ترین تصورات میں سے ہے۔ عام زبان میں حقیقت سے مراد وہ بات لی جاتی ہے جو سچ ہو، اصل ہو اور وہم و خیال نہ ہو۔ فلسفے میں یہ سوال زیادہ گہرا ہو جاتا ہے: کیا نظر آنے والی دنیا ہی اصل حقیقت ہے یا اس کے پیچھے کوئی اور حقیقت چھپی ہے؟ کیا حقیقت ایک ہے یا کئی؟ کیا حقیقت مادی ہے، ذہنی ہے یا روحانی؟ اور ہم حقیقت کو جان کیسے سکتے ہیں؟ ہر بڑے فلسفی نظام نے ان سوالات کا اپنا جواب دیا ہے اور انہی جوابات کے اختلاف سے مکاتب فکر بنے ہیں۔ اس جواب میں حقیقت کے مفہوم، مظہر اور اصل کے فرق، مختلف مکاتب کے تصورات اور اسلامی فکر کی روشنی میں حقیقت کے متوازن تصور کو بیان کیا جائے گا۔

حقیقت کے سوال کی عملی اہمیت بھی کم نہیں ہے۔ انسان کی زندگی کے بڑے فیصلے اسی پر منحصر ہیں کہ وہ کس چیز کو اصل سمجھتا ہے۔ جو شخص صرف مادی دنیا کو حقیقت سمجھتا ہے اس کی زندگی کی ترجیحات اور ہوں گی اور جو شخص آخرت اور روحانی حقیقت کو بھی اصل مانتا ہے اس کی ترجیحات اور ہوں گی۔ اسی طرح سائنس، مذہب، فن اور اخلاق سب حقیقت کے کسی نہ کسی تصور پر قائم ہیں۔ سائنس قابل مشاہدہ حقیقت کو موضوع بناتی ہے، مذہب غیبی حقائق کا بھی دعویٰ کرتا ہے، اور فن ظاہری صورت کے پیچھے جذباتی و معنوی حقیقت کو پیش کرتا ہے۔ اس لیے حقیقت کا تصور سمجھے بغیر نہ فلسفہ سمجھ آتا ہے نہ مختلف علوم کے باہمی تعلق کی نوعیت واضح ہوتی ہے۔

مظہر اور حقیقت کا فرق

فلسفے میں حقیقت کو سمجھنے کی پہلی صورت مظہر اور اصل کا فرق ہے۔ ہماری حواس تک جو کچھ پہنچتا ہے وہ اشیا کی ظاہری صورت ہے: رنگ، آواز، سختی، مٹھاس وغیرہ۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ ظاہری صورتیں ہی شے کی اصل ہیں یا ان کے پیچھے کوئی جوہر ہے جو انہیں سہارا دیتا ہے۔ قدیم یونانی مفکر افلاطون نے اس فرق کو مشہور انداز میں پیش کیا۔ ان کے نزدیک محسوس دنیا بدلتی رہتی ہے اس لیے کامل حقیقت نہیں ہو سکتی؛ اصل حقیقت مثالوں کی دنیا ہے جہاں ہر چیز کی کامل صورت موجود ہے۔ محسوس اشیا ان مثالوں کی ناقص

نقول ہیں۔ اس کے برعکس ارسطو نے کہا کہ صورت اور مادہ اسی دنیا میں مل کر حقیقت بنتے ہیں اور کلیات اشیا سے الگ کوئی جدا دنیا نہیں رکھتیں۔ یہ قدیم اختلاف آج تک فلسفے میں مختلف صورتوں میں زندہ ہے۔

اس فرق کو روزمرہ مثال سے بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ پانی کبھی مائع، کبھی برف اور کبھی بھاپ ہوتا ہے؛ صورتیں بدلتی ہیں مگر ہم تینوں کو پانی ہی کہتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ ہم ظاہر کے پیچھے ایک تسلسل اور اصل کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ اسی طرح انسان بچپن سے بڑھاپے تک بدلتا ہے مگر اس کی شخصیت کی وحدت برقرار سمجھی جاتی ہے۔ فلسفی اسی تجربے کو لے کر پوچھتا ہے کہ تبدیلی کے پیچھے قائم رہنے والی چیز کیا ہے۔ بعض نے اسے مادہ کہا، بعض نے صورت کہا، بعض نے جوہر کہا اور بعض نے اس فرق ہی کو وہم قرار دیا۔ ان جوابات کے اختلاف سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت کا تصور کوئی طے شدہ بدیہی بات نہیں بلکہ فلسفے کی سب سے زیادہ غور طلب بحثوں میں سے ہے۔

مادیت، تصوریت اور دیگر مکاتب کا تصورِ حقیقت

حقیقت کے بارے میں پہلا بڑا مکتب مادیت ہے۔ اس کے نزدیک اصل حقیقت مادہ اور اس کی حرکات ہیں؛ ذہن، روح اور اقدار سب مادی عمل کی پیداوار ہیں۔ اس مکتب نے سائنس کی ترقی کے دور میں اثر پایا کیونکہ قابلِ پیمائش دنیا پر اس کی گرفت مضبوط محسوس ہوتی ہے۔ لیکن اس پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ محبت، انصاف، ذمہ داری اور شعور جیسے حقائق کو محض مادی ذرات کی حرکت میں کس طرح مکمل بیان کیا جا سکتا ہے۔ دوسرا مکتب تصوریت ہے جو حقیقت کو بنیادی طور پر ذہنی یا روحانی قرار دیتا ہے۔ اس کے بعض قائلین کے نزدیک خارجی دنیا کا وجود ذہن کے ادراک سے وابستہ ہے۔ اس مکتب کی قوت یہ ہے کہ وہ شعور کی اہمیت اجاگر کرتا ہے لیکن اس کی کمزوری یہ ہے کہ عام تجربے کی ٹھوس دنیا کو محض ذہن قرار دینا اطمینان بخش نہیں ہوتا۔

جدول: حقیقت کے اہم فلسفیانہ تصورات

مکتب	اصل حقیقت	بنیادی دعویٰ
مادیت	مادہ اور توانائی	ذہن و روح مادی عمل کا نتیجہ ہیں

حقیقت بنیادی طور پر تصوری و روحانی ہے	ذہن / روح	تصوریت
محسوسات کامل مثالوں کی نقول ہیں	عالم مثال	افلاطونی مثالیت
حقیقت اسی دنیا کی اشیا میں ہے	صورت + مادہ	ارسطوئی حقیقت پسندی
سچ وہ ہے جو عمل میں کارآمد ہو	عملی نتیجہ	عملیت
اللہ آخری حقیقت، کائنات حقیقی مگر محتاج	خالق + مخلوق	اسلامی تصور

تیسری اہم صورت دوئی اور وحدت کا اختلاف ہے۔ بعض مفکرین نے حقیقت کو دو اصولوں میں بانٹا، جیسے مادہ اور روح، یا خیر اور شر کی قوتیں۔ بعض نے حقیقت کو ایک ہی اصل کی مختلف صورتیں قرار دیا۔ چوتھی صورت عملیت کی ہے جو پوچھتی ہے کہ حقیقت کی نظری بحث سے زیادہ اہم یہ ہے کہ کوئی سا تصور زندگی میں کارآمد نتیجہ دیتا ہے۔ پانچویں صورت جدید سائنسی حقیقت پسندی کی ہے جس کے نزدیک سائنس کے بیان کردہ غیر مرئی ذرات اور قوتیں بھی حقیقی ہیں کیونکہ وہ مشاہدات کی بہترین توجیہ پیش کرتی ہیں۔ ان تمام مکاتب کا جائزہ لینے سے طالب علم سیکھتا ہے کہ حقیقت کا لفظ مختلف نظاموں میں مختلف معنی رکھتا ہے اور کسی مفکر کو پڑھتے ہوئے پہلے یہ طے کرنا پڑتا ہے کہ وہ حقیقت سے مراد کیا لے رہا ہے۔

حقیقت اور سچائی کا تعلق

فلسفے میں حقیقت کے ساتھ سچائی کا سوال بھی جڑا ہوا ہے۔ حقیقت اشیا کی اصل حالت ہے جبکہ سچائی ہمارے بیان اور دعوے کی وہ کیفیت ہے جو حقیقت کے مطابق ہو۔ ایک بیان سچا تب کہلاتا ہے جب وہ واقعے کے مطابق ہو؛ اسے مطابقت کا نظریہ سچائی کہا جاتا ہے۔ اس کے مقابل بعض مفکرین نے ہم آہنگی کو معیار بنایا کہ سچا بیان وہ ہے جو ہمارے باقی مسلمہ علم سے ٹکراتا نہ ہو۔ بعض نے عملی نتیجے کو معیار بنایا۔ یہ بحث بظاہر تکنیکی لگتی ہے مگر اس کے نتائج بڑے ہیں۔ مذہبی، سائنسی اور تاریخی دعوؤں کو پرکھنے کا معیار اسی بحث سے نکلتا ہے۔ اگر سچائی کا کوئی معیار ہی نہ ہو تو ہر دعویٰ برابر ہو جائے اور علم کا تصور ختم ہو جائے۔ اس لیے فلسفہ حقیقت کے ساتھ سچائی کے معیار کی حفاظت بھی کرتا ہے۔

اس بحث کا ایک پہلو حقیقت کی سطحیں ہیں۔ بعض حقائق ظاہری اور عام مشاہدے کے ہیں، بعض گہرے اور نظری ہیں، اور اسلامی فکر میں بعض غیبی ہیں جو وحی سے معلوم ہوتے ہیں۔ ان سطحوں کو خلط کرنا غلط فہمی پیدا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر سورج کا مشر□ □ سے نکلنا ظاہری بیان ہے جبکہ زمین کی گردش اس کی علمی توجیہ ہے؛ دونوں اپنے اپنے دائرے میں درست استعمال رکھتے ہیں۔ اسی طرح اخلاقی حقیقتیں لیبارٹری میں ناپی نہیں جا سکتیں مگر اس سے وہ غیر حقیقی نہیں ہو جاتیں۔ ایک متوازن فلسفیانہ ذہن ہر قسم کی حقیقت کو اس کے مناسب ذریعے علم سے جاننے کی کوشش کرتا ہے: محسوسات کو حواس سے، عقلی کلیات کو عقل سے اور غیبی امور کو معتبر وحی سے۔ یہی تقسیم آگے ابن طفیل والے سوال میں بھی مدد دے گی۔

اسلامی فکر میں حقیقت کا متوازن تصور

اسلامی فکر میں آخری اور کامل حقیقت اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جسے حق کہا گیا ہے۔ کائنات کی حقیقت اس سے مشتق اور اس کی مخلوق ہے؛ وہ خیال یا وہم نہیں بلکہ حقیقی ہے مگر خود قائم نہیں۔ اس تصور میں نہ مادیت کی یک طرفہ تنگی ہے نہ تصوریت کی انتہا۔ مادی دنیا کو حقیقی ماننے سے سائنس، محنت اور اسباب کی اہمیت برقرار رہتی ہے، اور اسے محتاج و فانی ماننے سے انسان غرور اور مادہ پرستی سے بچتا ہے اور زندگی کو بڑے مقصد سے جوڑتا ہے۔ مسلم فلاسفہ نے اسی لیے وجود کے مراتب بیان کیے ہیں: واجب الوجود جو اپنے آپ سے قائم ہے اور ممکن الوجود جو اپنے وجود کے لیے دوسرے کا محتاج ہے۔ یہ درجہ بندی حقیقت کے تصور کو نہایت واضح اور منظم صورت دیتی ہے۔

اسلامی تصور کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں حقیقت اور قدر آپس میں جدا نہیں ہوتے۔ مغربی فکر میں اکثر حقیقت کو اقدار سے الگ غیر جانبدار چیز سمجھا گیا جس سے یہ سوال پیدا ہوا کہ سچائی سے اچھائی کا حکم کیسے نکلے۔ اسلامی فکر میں چونکہ آخری حقیقت خود عادل و رحیم خالق ہے، اس لیے حقیقت کو جاننا انسان کو ذمہ داری اور اخلاق کی طرف بھی لے جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں آیات کائنات پر غور و فکر کی دعوت عبادت و شکر کے ساتھ جڑی ہوئی ملتی ہے۔ البتہ اس مرحلے پر بھی احتیاط برقرار رکھنی چاہیے کہ فلسفیانہ بیانات اور اعتقادی احکام کا اطلاق اہل علم کا میدان ہے؛ یہ گائیڈ صرف تعلیمی نقشہ پیش کرتی ہے تاکہ طالب علم مختلف تصورات کو پہچان سکے۔

نتیجہ

نتیجہ یہ ہے کہ فلسفے میں حقیقت کا تصور مظہر و اصل کے فرق سے شروع ہو کر مادیت، تصوریت، مثالیت، حقیقت پسندی اور عملیت جیسے مکاتب میں مختلف صورتوں میں سمجھا جاتا ہے۔ کسی نے مادے کو اصل کہا، کسی نے مثال کو، کسی نے ذہن کو اور کسی نے صورت و مادے کے اجتماع کو۔ سچائی کے معیار کی بحث اسی تصور کی تکمیل ہے۔ اسلامی فکر ان سب کے مقابلے میں ایک متوازن تصور پیش کرتی ہے جس میں اللہ آخری حق ہے، کائنات حقیقی مگر محتاج ہے، اور علم کے مختلف ذرائع اپنی اپنی سطح کی حقیقت تک رسائی دیتے ہیں۔ طالب علم کے لیے اصل سبق یہ ہے کہ وہ حقیقت کے لفظ کو ہر نظام میں اس کے مخصوص معنی کے ساتھ سمجھے اور کسی ایک سطح کی حقیقت کو کل حقیقت سمجھنے کی غلطی نہ کرے۔

سوال نمبر 4: ابن طفیل کے نزدیک حصولِ معرفت کا بنیادی ذریعہ کیا ہے؟ (20)

تعارف

ابن طفیل اندلس کے مشہور فلسفی اور طبیب ہیں جن کی شہرت کا سب سے بڑا سبب ان کی فلسفیانہ داستان حی بن یقظان ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے ایک ایسے انسان کی کہانی پیش کی ہے جو تنہا جزیرے پر پرورش پاتا ہے، اس کے پاس نہ زبان ہے، نہ استاد، نہ کتاب اور نہ مذہبی تعلیم، مگر وہ بتدریج مشاہدے، تجربے اور غور و فکر سے کائنات، اپنے آپ اور بالآخر خالق تک کی معرفت حاصل کر لیتا ہے۔ اس داستان کے ذریعے ابن طفیل نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ معرفت کا بنیادی ذریعہ کیا ہے؟ انسان اپنی فطری عقل اور تجربے سے کہاں تک پہنچ سکتا ہے اور وحی کی ضرورت کس مقام پر واضح ہوتی ہے؟ اس جواب میں انہی سوالات کو ترتیب سے بیان کیا جائے گا۔

اس سوال کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ یہ علم کے مصادر کی قدیم بحث کو ایک کہانی کی صورت میں نہایت دلچسپ اور قابلِ فہم بنا دیتا ہے۔ فارابی اور ابن سینا نے معرفت کے نظری اصول بیان کیے تھے؛ ابن طفیل نے انہیں ایک زندہ کردار کی زندگی میں ڈھال کر دکھایا۔ حی کی زندگی کے مراحل دراصل انسانی عقل کی نشوونما کے مراحل ہیں: پہلے حواس کا مشاہدہ، پھر تجربے سے اصول اخذ کرنا، پھر عام کلیات بنانا، اور آخر میں مابعد الطبیعی غور سے آخری حقیقت تک پہنچنا۔ اس کہانی کو پڑھنے سے پہلے یہ طے کرنا ضروری ہے

کہ ابن طفیل کا مرکزی دعویٰ کیا ہے۔ وہ عقل کی مکمل نفی نہیں کرتے اور نہ ہی وحی کو بے معنی قرار دیتے ہیں؛ ان کی کوشش دونوں کے دائرے اور باہمی تعلق کو واضح کرنا ہے۔

حی بن یقظان کی کہانی کا خلاصہ

داستان کے مطابق حی ایک غیر آباد جزیرے پر یا تو خود رو طور پر پیدا ہوتا ہے یا بچپن میں وہاں پہنچ جاتا ہے۔ ایک ہرنی اسے دودھ پلاتی اور پالتی ہے۔ بچپن میں وہ جانوروں کو دیکھ کر ان کی آوازوں اور حرکات کی نقل کرتا ہے۔ ہرنی کی وفات اس کی زندگی کا پہلا بڑا صدمہ بنتی ہے۔ وہ اس کے جسم کو جانچ کر سمجھنے کی کوشش کرتا ہے کہ زندگی کی وہ چیز کیا تھی جو اب باقی نہیں رہی۔ جسم کے اعضا کا تجرباتی معائنہ کر کے وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ بدن سے الگ ایک غیر مرئی جوہر، یعنی روح، زندگی کی اصل ہے۔ یہ موڑ کہانی میں بڑا اہم ہے کیونکہ یہاں سے حی کا سفر محض جسمانی بقا سے آگے بڑھ کر فلسفیانہ جستجو بن جاتا ہے۔

آگے چل کر حی آگ کا استعمال، لباس، اوزار، رہائش اور شکار کے طریقے خود سیکھتا ہے۔ وہ جانداروں اور بے جان چیزوں کی درجہ بندی کرتا ہے، عناصر اور اجسام کی خصوصیات پر غور کرتا ہے اور علت و معلول کے اصول سے کائنات کے نظم کو دیکھنے لگتا ہے۔ آسمان، ستاروں اور اجرام کی باقاعدہ گردش دیکھ کر وہ ایک مدبر اور قادر ہستی کے وجود تک پہنچتا ہے۔ کہانی کے آخری حصے میں ایک اور انسان، ابسال، جو ایک آباد جزیرے سے مذہبی تعلیم لے کر آیا ہوتا ہے، حی سے ملتا ہے۔ دونوں تبادلہ خیال سے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ حی نے عقل و مشاہدے سے جو حقائق پائے ہیں وہ وحی کی بنیادی تعلیمات سے ہم آہنگ ہیں، البتہ وحی نے انہیں اجتماعی زندگی کے لیے احکام، عبادات اور علامتی بیانات کی صورت بھی دی ہے۔ یہ اختتام ابن طفیل کے اصل مقصد کو واضح کرتا ہے۔

مشاہدہ و تجربہ: معرفت کی پہلی بنیاد

ابن طفیل کے نزدیک معرفت کی پہلی سیڑھی حواس کا مشاہدہ اور تجربہ ہے۔ حی سب سے پہلے دیکھنے، سننے، سونگھنے اور چھونے سے سیکھتا ہے۔ وہ کھانے کے قابل چیزوں کو آزماتا ہے، خطرات کو تجربے سے پہچانتا ہے اور فطرت کے باقاعدہ رویوں سے اصول بناتا ہے۔ یہی جدید سائنسی طریقے کی ابتدائی صورت ہے جس میں مفروضہ، مشاہدہ، تجربہ اور

نتیجہ اخذ کرنا شامل ہوتا ہے۔ ابن طفیل کا نکتہ یہ ہے کہ تجربہ کتابی معلومات سے پہلے آتا ہے اور عقل کے لیے خام مواد فراہم کرتا ہے۔ بغیر مشاہدے کے عقل کے پاس غور کرنے کو کچھ نہیں ہوتا۔ اس لیے ان کے نظام میں حواس کو حقیر نہیں سمجھا گیا بلکہ انہیں معرفت کا ناگزیر آغاز قرار دیا گیا ہے۔ ہرنی کی موت کے بعد جسم کا مطالعہ اس کی بہترین مثال ہے کہ حی جذباتی صدمے کو بھی تحقیقی سوال میں بدل لیتا ہے۔

جدول: حی بن یقظان میں معرفت کے مراحل

مرحلہ	ذریعہ	حاصل شدہ معرفت
بچپن	حواس و نقل	ماحول، خوراک، خطرے کی پہچان
ہرنی کی موت	تجربہ و معائنہ	روح کا جسم سے الگ جوہر ہونا
جوانی	تجربہ و مہارت	آگ، اوزار، اجسام کی درجہ بندی
بلوغ فکری	عقلی استدلال	علت اولیٰ اور خالق کا وجود
آخری مرحلہ	مشاہدہ باطنی و غور	آخری حقیقت سے قرب و ہم آہنگی
ابسال سے ملاقات	وحی سے موازنہ	عقل و وحی کی بنیادی ہم آہنگی

تجربے کی اس اہمیت کے ساتھ ابن طفیل اس کی حد بھی واضح کرتے ہیں۔ تجربہ جزئیات دیتا ہے مگر کلی اصول عقل بناتی ہے۔ بار بار ایک طرح کے واقعات دیکھ کر ذہن قاعدہ اخذ کرتا ہے کہ ہر حرکت کا کوئی محرک ہوتا ہے اور ہر مصنوع کے پیچھے کوئی صانع ہوتا ہے۔ اسی طرح جزیرے کا محدود ماحول بھی حی کی معرفت کو محدود رکھتا ہے؛ زبان، تاریخ، معاشرتی احکام اور گزشتہ اقوام کے تجربات اس کے پاس نہیں ہوتے۔ یہ کمی آگے چل کر وحی و تعلیم کی ضرورت کو ظاہر کرتی ہے۔ چنانچہ ابن طفیل کے نزدیک تجربہ بنیادی ضرور ہے لیکن تنہا کافی نہیں؛ وہ عقل کی عمارت کی اینٹیں فراہم کرتا ہے، نقشہ نہیں بناتا۔ یہ توازن ان کے فکر کو محض تجربیت پسندی سے الگ کرتا ہے۔

عقل و استدلال: بنیادی ذریعہ

سوال کا مرکزی جواب یہ ہے کہ ابن طفیل کے نزدیک حصول معرفت کا بنیادی ذریعہ انسانی عقل ہے جو مشاہدے اور تجربے سے حاصل شدہ مواد پر استدلال کر کے کلی حقائق تک پہنچتی ہے۔ حی کسی استاد کے بغیر اس لیے آگے بڑھ سکا کیونکہ اس کی فطرت سلیم تھی اور عقل کو اس نے مسلسل استعمال کیا۔ وہ مماثلت اور فرق سے درجہ بندی کرتا ہے، علت سے معلول اور معلول سے علت کا پتہ چلاتا ہے، اور اپنے ہی وجود پر غور کر کے نفس کی حقیقت تک جاتا ہے۔ کائنات کے نظم سے خالق تک پہنچنا اسی عقلی استدلال کی بلند ترین صورت ہے۔ فارابی کی طرح ابن طفیل بھی سمجھتے ہیں کہ عقل محض حساب کتاب نہیں بلکہ حقیقت کو دریافت کرنے کی الٰہی عطا ہے، اس لیے اس کا درست استعمال انسان کو سچائی تک لے جا سکتا ہے۔

عقل کے اس مقام کی وضاحت میں ابن طفیل نے تدریج کو بڑی اہمیت دی ہے۔ حی ایک دن میں فلسفی نہیں بن جاتا اسے برسوں لگتے ہیں۔ راستے میں وہ غلط نتائج بھی نکالتا ہے اور بعد کے تجربات سے انہیں درست کرتا ہے۔ یہ تصویری بیان دراصل ہر طالب علم کے تجربے کی ترجمانی ہے، کہ معرفت صبر، تسلسل اور خود احتسابی کا نام ہے۔ اس سے ایک اور اصول نکلتا ہے کہ عقل کی تربیت ماحول اور توجہ سے ہوتی ہے۔ حی کا ذہن جزیرے کی خاموشی میں منتشر نہیں ہوتا، اس لیے اس کی توجہ گہری ہوتی جاتی ہے۔ جدید دور میں جہاں توجہ بٹانے والے ذرائع بے شمار ہیں، ابن طفیل کی یہ تعلیم خاص طور پر پر معنی ہے کہ گہری معرفت کے لیے مشاہدے کی سچائی اور فکر کی یکسوئی دونوں درکار ہیں۔

وجدان و مشاہدہ باطنی اور وحی کا مقام

کہانی کے آخری درجات میں حی محض استدلال سے آگے بڑھ کر ایک ایسی کیفیت تک پہنچتا ہے جسے مفکرین نے ذوق، وجدان یا مشاہدہ باطنی سے تعبیر کیا ہے۔ استدلال سے وہ خالق کے وجود کو ثابت کرتا ہے مگر آخری قرب کا تجربہ الفاظ اور دلیلوں سے آگے کی چیز سمجھا گیا ہے۔ ابن طفیل اس درجے کو صوفیانہ تجربے کے قریب رکھتے ہیں۔ یہاں احتیاط ضروری ہے کہ اس تعبیر کو ہر فلسفی و متکلم نے ایک ہی طرح قبول نہیں کیا۔ بعض کے نزدیک یہ فلسفے کی حد بندی ہے اور بعض کے نزدیک اس کا تکمیلی پہلو۔ تعلیمی سطح پر

اتنا کہنا درست ہے کہ ابن طفیل کے نظام میں معرفت کی ترتیب حواس سے عقل اور عقل سے باطنی مشاہدے کی طرف جاتی ہے اور ہر اگلا درجہ پچھلے کو منسوخ نہیں کرتا بلکہ اسے گہرا کرتا ہے۔

وحی کے بارے میں ابن طفیل کا موقف اکثر غلط سمجھا جاتا ہے۔ وہ وحی کے مخالف نہیں ہیں۔ ابسال کے کردار کے ذریعے وہ دکھاتے ہیں کہ وحی کی بنیادی سچائیاں، یعنی خالق کا وجود، اخلاقی ذمہ داری اور آخرت، وہی ہیں جن تک سلیم عقل بھی پہنچ سکتی ہے۔ فرق انداز اور دائرے کا ہے۔ وحی ان حقائق کو عام انسانوں کے لیے آسان زبان، مثالوں اور عملی احکام کی صورت میں پیش کرتی ہے تاکہ پورا معاشرہ ان سے فائدہ اٹھا سکے۔ خالص عقلی معرفت چند اہل فکر تک محدود رہتی ہے اور سماجی نظام نہیں بنا سکتی۔ اس لیے عملی زندگی میں وحی کی رہنمائی ناگزیر ہے۔ یوں ابن طفیل کے نزدیک بنیادی ذریعہ عقل ہونے کے باوجود تکمیلی اور سماجی ذریعہ وحی ہے۔ یہی ان کا متوازن پیغام ہے جو عقل پرستی اور عقل دشمنی دونوں انتہاؤں سے بچتا ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ ابن طفیل کے نزدیک حصول معرفت کا بنیادی ذریعہ سلیم انسانی عقل ہے جو حواس کے مشاہدے اور مسلسل تجربے سے مواد لے کر استدلال کے ذریعے کلی حقائق، نفس کی حقیقت اور بالآخر خالق کے وجود تک پہنچتی ہے، اور اپنے بلند ترین درجے پر باطنی مشاہدے سے قریب ہوتی ہے۔ حی بن یقظان اسی سفر کی ادبی و فلسفیانہ تمثیل ہے۔ ساتھ ہی ابن طفیل وحی کی اہمیت برقرار رکھتے ہیں کیونکہ وحی انہی حقائق کو اجتماعی زندگی کے لیے عملی نظام اور عام فہم بیان فراہم کرتی ہے۔ اس توازن کی وجہ سے ان کی کتاب مشرق و مغرب دونوں میں صدیوں پڑھی جاتی رہی۔ طالب علم کے لیے سبق یہ ہے کہ معرفت کے لیے کتاب کے ساتھ مشاہدہ، تجربہ اور اپنا غور و فکر بھی لازم ہے؛ محض رٹا علم نہیں بنتا۔

سوال نمبر 5: اسلامی فکر میں خیر و شر کا معیار کس بنیاد پر قائم ہے؟ (20)

تعارف

خیر و شر کا سوال انسانی زندگی کے قدیم ترین سوالات میں سے ہے۔ ہر وہ کس عمل کو اچھا کہا جائے اور کسے برا؟ کیا اچھائی اور برائی چیزوں کی ذاتی خصوصیات ہیں یا انسانی پسند و ناپسند کا نام ہیں؟ کیا معیار عقل طے کرتی ہے، معاشرہ طے کرتا ہے یا وحی طے کرتی ہے؟ اسلامی فکر نے ان سوالات کا اپنا منظم جواب دیا ہے جس میں وحی کو اصل معیار مانا گیا ہے، عقل کو اس معیار کو سمجھنے اور اطلاق کرنے کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے، اور فطرت انسانی کو اس سے ہم آہنگ سمجھا گیا ہے۔ اس جواب میں پہلے خیر و شر کے مفہوم، پھر مختلف رجحانات کا مختصر جائزہ، پھر اہل سنت کے متوازن موقف، اور آخر میں اس معیار کے عملی نتائج بیان کیے جائیں گے۔ یہ بحث خالص علمی ہے؛ کسی مخصوص فرد یا واقعے پر شرعی حکم کا اطلاق مستند اہل علم و مجاز اداروں کا کام ہے۔

اس سوال کی اہمیت دور حاضر میں بہت بڑھ گئی ہے۔ جب ہر معاشرہ اپنی اقدار خود بنانے کا دعویٰ کرتا ہے تو اچھائی اور برائی کا کوئی مستقل معیار باقی نہیں رہتا۔ آج ایک چیز مقبول ہے تو اچھی سمجھی جاتی ہے اور کل ناپسند ہو جائے تو بری کہلاتی ہے۔ اس تبدیلی سے قانون، خاندان، تجارت اور میڈیا سب متاثر ہوتے ہیں۔ اسلامی فکر اس مسئلے کا حل ایک ایسے معیار میں دیتی ہے جو انسانی خواہشات اور مقبولیت سے بلند ہو مگر انسان کی فطرت سے بیگانہ بھی نہ ہو۔ اسی لیے یہ موضوع صرف نظری نہیں رہتا بلکہ ہر مسلمان کی روزمرہ زندگی، اس کے پیشے، اس کے خاندانی تعلقات اور اس کے سماجی رویے سے براہ راست متعلق ہے۔ اگلے عنوانات میں اس معیار کی بنیادوں کو الگ الگ واضح کیا جائے گا۔

خیر و شر کا مفہوم اور فطرت سے ہم آہنگی

خیر سے مراد وہ امر ہے جو انسان کی حقیقی فلاح، کمال اور مقصد زندگی سے ہم آہنگ ہو اور شر وہ ہے جو اس فلاح کو نقصان پہنچائے۔ اسلامی نقطہ نظر میں خیر و شر محض ذاتی پسند نہیں ہیں۔ زہر نقصان دہ ہے چاہے کوئی اسے پسند کرے اور دوا نافع ہے چاہے اس کا ذائقہ کڑوا ہو۔ اسی طرح سچ، عدل اور امانت خیر ہیں اور جھوٹ، ظلم اور خیانت شر ہیں، خواہ کسی دور میں ان کی مقبولیت کم یا زیادہ ہو۔ انسان کی فطرت سلیم اصل میں خیر کو پہچانتی اور اس کی طرف مائل ہوتی ہے؛ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی مختلف تہذیبوں میں سچائی و انصاف

کو پسند اور ظلم و دھوکے کو ناپسند کرنے کا اشتراک پایا جاتا ہے۔ اسلام اس فطری میلان کو بنیاد مانتا ہے مگر اسے حتمی معیار نہیں بناتا کیونکہ فطرت تربیت، ماحول اور خواہشات سے متاثر ہو کر بگڑ بھی سکتی ہے۔

فطرت کے بگڑنے کی مثالیں تاریخ میں عام ہیں۔ جن معاشروں میں سود، جوا یا کمزوروں کا استحصال معمول بن جاتا ہے وہاں عام آدمی بھی انہیں برائی محسوس کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسانی پسند و احساس خیر و شر کی نشاندہی میں مدد گار ضرور ہیں مگر آخری فیصلہ کن معیار نہیں بن سکتے۔ اسی نکتے پر اسلامی فکر مغربی اخلاقیات کے بعض رجحانات سے الگ ہوتی ہے جہاں خوشی، افادیت یا اکثریت کی پسند کو معیار بنایا گیا۔ اسلامی فکر خوشی اور فائدے کو یکسر رد نہیں کرتی؛ وہ کہتی ہے کہ حقیقی اور دیرپا فلاح، جس میں دنیا و آخرت دونوں شامل ہوں، وہی خیر کا اصل پیمانہ ہے، اور اس فلاح کی درست تعریف انسان کی محدود عقل تنہا نہیں کر سکتی۔ اس لیے معیار کی تلاش وحی کی طرف لے جاتی ہے۔

وحی: خیر و شر کا اصل معیار

اسلامی فکر میں خیر و شر کا اصل اور بنیادی معیار وحی یعنی قرآن و سنت ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کا خالق ہے، اس کی فطرت، اس کی صلاحیتوں اور اس کے انجام کو سب سے بہتر جانتا ہے، اس لیے اس کا حکم ہی اچھائی اور برائی کی آخری کسوٹی ہے۔ جو عمل اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے مطابق ہو وہ خیر ہے اور جو اس کے خلاف ہو وہ شر ہے۔ اس بنیاد سے اخلاقی نظام کو استحکام ملتا ہے؛ معیار رائے عام، حکمران کی خواہش یا دور کی فیشن سے نہیں بدلتا۔ اسی لیے نماز، زکاۃ، والدین سے حسن سلوک اور عدل جیسے امور ہر دور میں خیر رہتے ہیں اور سود، ظلم، قتل ناحق اور خیانت ہر دور میں شر رہتے ہیں۔ وحی کی یہ بنیاد اخلاق کو محض سماجی معاہدے کے بجائے ایمان و عبادت سے جوڑ دیتی ہے جس سے اس کی پابندی کا محرک قانون کے خوف سے گہرا ہو جاتا ہے۔

جدول: خیر و شر کے معیار کے اہم رجحانات

اسلامی جائزے کا خلاصہ	معیار	رجحان

اصل و حتمی معیار	قرآن و سنت کا حکم	وحی و شریعت
عقل معاون ہے، تنہا حتمی نہیں	عقل تنہا	محض عقلی حسن و قبح
جزوی فائدہ معیار کا حصہ، کل نہیں	زیادہ سے زیادہ فائدہ	افادیت
عارضی لذت حقیقی فلاح نہیں	خوشی و لذت	لذت پسندی
عرف بدلتا ہے، حتمی معیار نہیں	اکثریت کی پسند	سماجی عرف

وحی کے معیار ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ ہر جزئی صورت کا تفصیلی حکم نص میں موجود ہو یا عقل کا کوئی کام ہی نہ ہو۔ شریعت نے اصول و کلیات دیے ہیں، مقاصد بیان کیے ہیں اور بہت سے معاملات کو انسان کی اجتہادی کوشش کے لیے کھلا چھوڑا ہے۔ نئے مسائل، جیسے جدید طبی، مالیاتی اور ٹیکنیکی معاملات میں انہی اصولوں کی روشنی میں غور کیا جاتا ہے۔ یہ اجتہاد بھی من مانی نہیں ہوتا؛ اس کے اصول مقرر ہیں اور یہ کام اہلیت رکھنے والے اہل علم کا ہے۔ عام طالب علم یا فرد کے لیے درست رویہ یہ ہے کہ واضح احکام کی پابندی کرے، مشکل معاملات میں مستند اہل علم سے رجوع کرے اور اپنی ذاتی پسند کو شریعت کا معیار نہ بنائے۔ اس احتیاط سے معیار کی وحدت بھی قائم رہتی ہے اور زمانے کے تقاضوں کا جواب بھی ملتا رہتا ہے۔

عقل کا کردار: فہم، اطلاق اور جزوی ادراک

وحی کو معیار ماننے کے ساتھ اسلامی فکر عقل کو اہم کردار دیتی ہے۔ عقل وحی کو سمجھتی ہے، اس کے احکام کی حکمتیں تلاش کرتی ہے، غیر منصوص مسائل میں اصولوں کا اطلاق کرتی ہے اور بہت سے امور کی ظاہری اچھائی یا برائی کا ابتدائی ادراک بھی رکھتی ہے۔ اہل سنت کے بڑے مکاتب میں اس نکتے پر تفصیلی بحث رہی ہے کہ عقل کس حد تک حسن و قبح کا ادراک کر سکتی ہے۔ اشاعرہ نے شرعی حکم کو اصل قرار دینے پر زیادہ زور دیا جبکہ ماتریدیہ نے عقل کے ادراک کو نسبتاً زیادہ وسعت دی، لیکن دونوں کا اتفاق اس پر ہے کہ

ثواب و عذاب اور شریعت کے تفصیلی احکام کی بنیاد وحی ہے اور عقل تنہا شارع نہیں بن سکتی۔ اس تعلیمی خلاصے کے بعد کسی جزئی فقہی و کلامی اختلاف میں حتمی ترجیح کا معاملہ اہل علم پر چھوڑنا ہی مناسب ہے۔

عقل کے اس متوازن مقام سے دو انتہائیں ختم ہو جاتی ہیں۔ ایک طرف وہ رجحان رد ہوتا ہے جو عقل کو بالکل معطل کر کے سمجھے بغیر تقلید کو کافی سمجھتا ہے، کیونکہ وحی خود غور و فکر کی بار بار دعوت دیتی ہے۔ دوسری طرف وہ رجحان بھی رد ہوتا ہے جو عقل کو وحی سے آزاد قانون ساز بنا دیتا ہے، کیونکہ انسانی عقل فرداً فرداً بھی مختلف ہے اور خواہشات و تعصبات سے متاثر بھی ہوتی ہے۔ اسلامی تعلیم میں عقل چراغ ہے اور وحی روشنی کا سرچشمہ بھی اور منزل کی رہنمائی بھی۔ چراغ کے بغیر راستہ نظر نہیں آتا اور رہنمائی کے بغیر چراغ بھٹک بھی سکتا ہے۔ اسی امتزاج نے مسلمانوں کی علمی تاریخ میں فلسفہ، کلام، فقہ اور اخلاق کی عظیم روایات پیدا کیں جن کا مطالعہ اسی کورس کا موضوع ہے۔

مقاصد شریعت اور انسانی فلاح کا پیمانہ

اسلامی فکر میں خیر و شر کو سمجھنے کا ایک اور اہم پیمانہ مقاصد شریعت ہیں۔ علما نے بیان کیا ہے کہ شریعت کے احکام مجموعی طور پر دین، جان، عقل، نسل اور مال جیسی بنیادی مصلحتوں کی حفاظت کے لیے آئے ہیں۔ جو عمل ان مصلحتوں کی حفاظت کرے وہ خیر کی طرف ہے اور جو انہیں برباد کرے وہ شر کی طرف ہے۔ اس پیمانے سے بہت سے جدید مسائل کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ مثال کے طور پر نشہ آور اشیا عقل و جان کو نقصان پہنچاتی ہیں، ماحولیاتی تباہی آنے والی نسلوں کی زندگی کو خطرے میں ڈالتی ہے، اور جعلی ادویات جان و مال دونوں کا اتلاف ہیں۔ مقاصد کا یہ فریم ورک ظاہر کرتا ہے کہ اسلامی معیار جامد لفظیات نہیں بلکہ انسانی فلاح کی گہری سمجھ پر مبنی ایک زندہ و متحرک نظام ہے، بشرطیکہ اس کا استعمال مقررہ اصولوں کے اندر اہل علم کے ذریعے ہو۔

اس بحث کا آخری عملی پہلو نیت اور نتیجے کا تعلق ہے۔ اسلام میں کسی عمل کی قدر صرف اس کے ظاہری نتیجے سے نہیں لگائی جاتی؛ نیت بھی دیکھی جاتی ہے۔ ایک ہی ظاہری عمل اچھی نیت سے خیر اور بری نیت سے شر بن سکتا ہے، جیسے دولت کا خرچ وقتی نمائش کے لیے ہو یا واقعی ضرورت مند کی مدد کے لیے۔ اسی طرح اچھی نیت برے ذریعے کو حلال نہیں بنا دیتی۔ مکمل اسلامی پیمانہ تین چیزوں کو جمع کرتا ہے: عمل شریعت کے مطابق ہو، نیت خالص ہو اور نتیجہ انسانی فلاح کے خلاف نہ ہو۔ یہ جامعیت اس معیار کو محض قانونی

یا محض جذباتی ہونے سے بچاتی ہے اور فرد کو ہر عمل سے پہلے خود احتسابی کی عادت دیتی ہے۔ یہی خود احتسابی معاشرے میں قانون کی عمل داری سے پہلے ضمیر کی عمل داری قائم کرتی ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی فکر میں خیر و شر کا معیار وحی پر قائم ہے: اللہ کے احکام اور شریعت کے اصول اچھائی و برائی کی آخری کسوٹی ہیں۔ فطرت اس معیار سے ہم آہنگ ہے اور اس کی ابتدائی پہچان دیتی ہے، عقل اسے سمجھنے، اس کی حکمت تلاش کرنے اور نئے مسائل پر اطلاق کرنے کا ذریعہ ہے، اور مقاصد شریعت اس معیار کی انسانی فلاح سے ہم آہنگی کو واضح کرتے ہیں۔ ذاتی لذت، اکثریت کی پسند یا وقتی افادیت کو حتمی معیار بنانے سے اسلامی فکر اتفاق نہیں کرتی کیونکہ یہ سب بدلتے رہتے ہیں۔ اس مستقل معیار کا فائدہ یہ ہے کہ فرد اور معاشرے کو اخلاقی استحکام ملتا ہے، حقوق و فرائض واضح رہتے ہیں اور اخروی جواب دہی کا احساس زندگی کو بامقصد بنا دیتا ہے۔ طالب علم کے لیے عملی سبق یہ ہے کہ وہ اپنی پسند کو معیار نہ بنائے بلکہ معیار کی روشنی میں اپنی پسند کو سنوارے۔